مقدمہ شعر و شاعری

الطاف حسین حالی

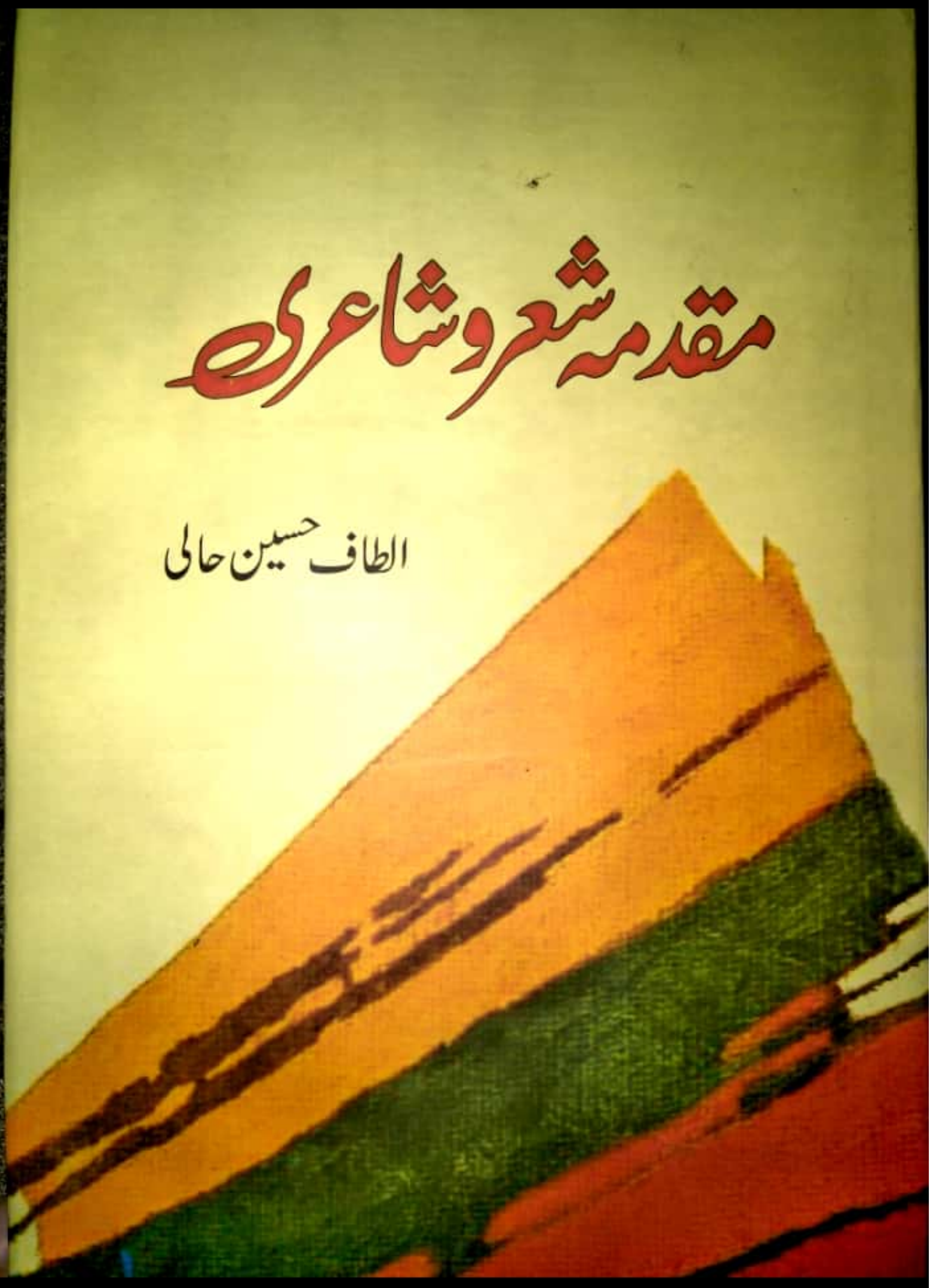

Scanned with CamScanner

مقدمہ شعر و شاعری

الطاف حسین حالی

مرتبین

شاہد نواز، محمد نعیم

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف سرگودھا

Scanned with CamScanner

سچا شعر کہنے کی صلاح کچھ اس لیے نہیں دی جاتی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہی نہیں بلکہ اس لیے دی جاتی ہے کہ تاثیر جو شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی۔ اس کے سوا علوم و معارف کی ترقی جو آج کل دنیا میں ہو رہی ہے وہ جھوٹی شاعری کو برباد کرنے والی ہے۔ جن دھکوسلوں پر پرانے مزاج کے لوگ ابھی تک سر دھنتے ہیں کوئی دن جاتا ہے کہ وہ دیوانوں کی بڑ سمجھے جائیں گے۔

نیچرل شاعری

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو نیچرل شاعری کا لفظ اکثر لوگوں کی زبان پر جاری ہے اس کی کسی قدر شرح کی جائے۔ بعض حضرات تو نیچرل شاعری اس شاعری کو سمجھتے ہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو یا جس میں نیچریوں کے مذہبی خیالات کا بیان ہو بعضے یہ خیال کرتے ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جس میں خاص مسلمانوں کی یا مطلقاً کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا ذکر کیا جائے، مگر نیچرل شاعری سے یہ دونوں معنی کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے، کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جا چکی ہے نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر اسے ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنی نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا مثلاً:

"کوئی رکھ کر زیر زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی"
"رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب"
(میر حسن)

یہ دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لیا گیا ہے وہاں ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ یا مثلاً:

Scanned with CamScanner

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح (ذوقؔ)

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے اسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے یا مثلاً:

تیرے رخسار و گیسو سے بتا تشبیہ دوں کیونکر
نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سنبل میں بو ایسی (ظفرؔ)

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بو معشوق کے رنگ و بو سے بہتر یا اس کے برابر نہیں معلوم ہوتی یا مثلاً:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومنؔ)

یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھ جاتا ہے اس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً:

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی — چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی
رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں — یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی
(داغؔ)

ان دونوں شعروں کا مضمون گو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتا ہے۔ مگر دونوں اپنی اپنی جگہ نیچر کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا و ہوس کا بھوت بڑے زور و شور کے ساتھ سر پر چڑھتا ہے مگر بہت جلد اتر جاتا ہے اور فی الواقع دنیا کی خواہشوں سے کبھی نیت سیر نہیں ہوتی۔ یا مثلاً:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکل اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں (غالبؔ)

یہ شعر بھی نیچرل ہے اور فطرت انسانی کی کسی قدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا ہے جس کے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے ایسے ہیں جن کو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہئے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں جن کو لفظاً یا معناً یا دونوں حیثیتوں سے نیچرل نہیں

Scanned with CamScanner

کہا جا سکتا۔ مثلاً:

کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی یاد مژہ دل کو
کبھی ہیں خار پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں (ناسخ)

اس شعر میں صرف لفظاً نیچرل کہا جا سکتا ہے لیکن معنی نہیں کہا جا سکتا، معشوق کے تصور سے بلاشبہ عاشق کو فرحت بھی ہوتی ہے اور رنج بھی۔ لیکن جب فرحت ہو تو عارض اور مژگان دونوں کے تصور سے فرحت ہونی چاہیے اور جب رنج ہو تو دونوں کے تصور سے رنج ہونا چاہیے یہ دونوں ہو سکتا ہے کہ پلکیں جو خار سے مشابہ ہیں ان کے تصور سے پہلو میں خار ہوں اور عارض جو گل سے مشابہ ہے اس کے تصور سے گلزار ہو۔ مثلاً:

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا (غالب)

جوہر اندیشہ میں کیسی گرمی ہو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس میں صحرانوردی کا خیال آنے سے خود صحرا جل اٹھے۔ یا مثلاً:

کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخ گل سے کوئی پھول
آتش گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں (امیر)

نزاکت کسی درجہ کی کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ آتش گل یعنی خود گل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں یا مثلاً:

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا (ذوق)

سرد مہری میں اتنی ہی ٹھنڈک ہو سکتی ہے جتنی کہ لفظ سرد میں۔ پھر اس کے کشتہ کی خاک میں اتنا اثر ہوتا ہے کہ اس سے شجر کافور پیدا ہو۔ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں جن میں معنی کا بالکل نام و نشان نہیں۔

ہر زبان میں نیچرل شاعری ہمیشہ قدما کے حصہ میں رہی ہے۔ مگر قدما کے اول طبقہ میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ انہیں کا دوسرا طبقہ اس کو سڈول بناتا ہے اور سانچے میں ڈھال کر خوشنما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے مگر اس کی نیچرل حالت کو اس خوشنمائی اور دلربائی میں

Scanned with CamScanner

بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ ان کے بعد متاخرین کا دور شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہ رکھتے اور خیالات کے اسی دائرہ میں محدود رہتے ہیں جو قدما نے ظاہر کیے تھے اور نیچر کے اس منظر سے جو قدما کے پیش نظر تھا آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے تو ان کی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل حالت سے تنزل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہ راست سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم، کچے الونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے انہیں پانی میں ابال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انہوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر مناسب اور مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی کے پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہے اس کے سوا اور کوئی موقع تنوع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے۔ اسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دلنشیں کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ فارسی زبان میں جس پر اُردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اول غزل لکھی ہوگی ضرور ہے کہ انہوں نے عشق و محبت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادے طور پر معشوق کی صورت، حسن و جمال نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا۔ ان کے بعد لوگوں نے انہیں باتوں کو مجاز اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان کیا۔ مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ و ناز و ادا کو مجاز تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا اور اس جدت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و بامزہ ہو گیا۔ متاخرین جب اسی مضمون پر پل پڑے اور ان کو قدما کے استعارہ سے بہتر کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا اور جدت پیدا کرنے کا خیال دامن گیر ہوا۔ انہوں نے تیغ و شمشیر کے مجازی معنوں سے قطع نظر کی اور اس سے خاص کر سروہی یا اصیل تلوار مراد لینے لگے جو قبضہ، باڑ، پیپلا، آب و تاب اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے، میان میں رہتی ہے، گلے میں حمائل کی جاتی ہے، زخمی کرتی، ٹکڑے اڑاتی ہے، سر اتارتی ہے، خون بہاتی ہے، چورنگ کاٹتی ہے؛ اس کی دھار تیز بھی ہو سکتی ہے اور کند بھی؛ قاتل کا ہاتھ اس کے مارنے سے تھک سکتا ہے، وہ قاتل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے؛ اس کے مقتول کا مقدمہ عدالت میں دائر ہو سکتا ہے، اس کا قصاص لیا جا سکتا ہے، اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے لیے ثابت کرنے لگے۔

یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہو جانے کو مجازاً یا دل باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا رفتہ رفتہ متاخرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ سے چھینا جا سکتا ہے، واپس لیا جا سکتا، کھویا اور پایا جا سکتا ہے۔ کبھی اس کی قیمت پر تکرار ہوتی ہے، سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے، ورنہ نہیں دیا جاتا کبھی اس کو معشوق عاشق سے لے کر کسی طاق میں ڈال کر بھول جاتا ہے، اتفاقاً وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور آنکھ بچا کو وہاں سے اڑا لاتا ہے، پھر معشوق کے ہاں اس کی ڈھنڈیا پڑتی ہے اور عاشق اس کی رسید نہیں دیتا۔ کبھی وہ یاروں کے جلسہ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ سارا گھر چھان مارتے ہیں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ اتفاقاً معشوق جو بالوں میں کنگھی کرتا ہے تو وہ جوں کی طرح جھڑ پڑتا ہے۔ کبھی وہ ایسا تلپٹ ہو جاتا ہے کہ زلف یار کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اس کی تلاش کی جاتی ہے مگر کہیں کچھ سراغ نہیں ملتا کبھی وہ بیع بالخیار کے قاعدے سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے کہ پسند آئے تو رکھنا ورنہ پھیر دینا، اور کبھی اس کا نیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے وہی لے جائے۔

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اس لئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے مجازاً صیاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اس پر تمام احکام حقیقی صیاد کے مرتب کر دیے۔ اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے، کہیں اس کو تیر مار کر گراتا ہے، کہیں ان کو زندہ پنجرے میں بند کرتا ہے، کہیں ان کے پر نوچتا ہے کہیں ان کو ذبح کر کے زمین پر تڑپتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر کمان لگا کر جنگل کی طرف جا نکلتا ہے، تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اس سے پناہ مانگتے ہیں، سیکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا، بیسوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں اور لووں اور بٹیروں کے اس کے دروازہ پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے چڑی مار اس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشقِ الٰہی یا محبت روحانی کو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ مجازاً شراب کے نشہ سے تعبیر کیا تھا اور اس مناسبت سے جام و صراحی خم و پیمانہ اور ساقی و مے فروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کیے تھے یا بعض شعرائے متصوفین نے شراب کو اس جہت سے کہ وہ اس دار الغرور کے تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ البال کرنے والی ہے بطور تفاول کے موصل الی المطلوب قرار دیا تھا، رفتہ رفتہ وہ اور اس کے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشاعرہ بلا مبالغہ کلاں کی دکان بن گئی، ایک کہتا ہے لا۔ دوسرا کہتا ہے اور لا،

تیسرا کہتا ہے پیالہ نہیں تو اوک ہی سے پلا، کچھ بہک رہے ہیں اور کچھ بنکا رہے ہیں کوئی واعظ پر پھبتی کستا ہے، کوئی زاہد کی ڈاڑھی پر ہاتھ لپکاتا ہے، کوئی شیخ کی پگڑی اچھالتا ہے۔ جوان اور بوڑھے جاہل اور عالم رند اور پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں جو ہے سو نشہ کے خمار میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جدھر دیکھو العطش العطش کی پکار ہے۔

یا مثلاً قدما نے لاغری بدن کو اندوہ عشق یا صدمہ جدائی کا ایک لازمی نتیجہ سمجھ کر اس کو کسی مؤثر طریقہ سے بیان کیا تھا۔ متاخرین نے رفتہ رفتہ اس کی نوبت یہاں تک پہنچادی کہ فراش جھاڑو دیتا ہے تو خس وخاشاک کے ساتھ عاشق زار کو بھی سمیٹ لیجاتا ہے۔ معشوق صبح کو اٹھتا ہے تو عاشق کو لاغری کے سبب بستر پر نہیں پاتا۔ لاچار بچھونا جھاڑ کر دیکھتا ہے تا کہ زمین پر کچھ گرتا ہوا معلوم ہو۔ عاشق کو موت ڈھونڈتی پھرتی ہے مگر لاغری کے سبب وہ اس کو کہیں نظر نہیں آتا میدانِ قیامت میں فرشتے چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور قاضی یوم الحساب منتظر بیٹھا ہے مگر عاشق کا لاغری کے سبب کہیں پتا نہیں چلتا۔ اسی طرح متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندھ گئے تھے نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچادیا۔ معشوق کے دہانہ کو تنگ کرتے صفحہ روزگار سے یک قلم منادیا؛ کمر کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کردیا؛ زلف کو دراز کرتے کرتے عمر خضر سے بھی بڑھادیا؛ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بدگمان بن گئے۔ جدائی کی رات کو طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا۔ الغرض جب پچھلے انہیں مضامین کو جو اگلے باندھ گئے ہیں اوڑھنا اور بچھونا بنالیتے ہیں تو ان کو مجبوراً نیچرل شاعری سے دست بردار ہونا اور میل کا بیل بنانا پڑتا ہے۔

اس بات کے زیادہ ذہن نشین کرنے کے لئے کہ شاعری کا آغاز کس حالت میں ہوتا ہے اور پھر قدما کا دوسرا طبقہ اس کو کس طرح اسی نیچرل حالت میں درست کرتا ہے اور ان کے بعد متاخرین اس کو کیا چیز بنادیتے ہیں، اُردو شعرا کے ہر طبقہ کے کلام میں سے کچھ کچھ مثالیں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی مثال شاہ آبرو جو اُردو شعرا کے سب سے پہلے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں وہ اس کیفیت کو جو معشوق کے دیکھنے سے عاشق کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں:

نین سیں نین جب ملائے گیا
دل کے اندر مرے سمائے گیا

Scanned with CamScanner

نگہ گرم سیں مرے دل میں
خوش نین آگ سی لگائے گیا

مرزا رفیع سودا جن کو دوسرے طبقہ میں شمار کرنا چاہیے وہ اسی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

میر تقی جو مرزا رفیع کے معاصرے میں وہ اسی کیفیت کو یوں ادا کرتے ہیں:

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے

خواجہ حیدر علی آتش جن کو چوتھے یا پانچویں طبقہ میں سمجھا گیا ہے وہ اسی کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

تختہ نردِ عشق دل کھیلا جو حسنِ یار سے
چھٹ گئے ایسے مرے چھکے کہ ششدر ہوگیا

دوسری مثال، شاہ آبرو اس طول مدت کو جو مفارقت کے زمانہ میں عاشق کو محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح بیان کرتے ہیں:

جدائی کے زمانہ کی بجن کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کو جو ہم پر گھڑی گذری سو جگ بیتا

اسی مضمون کو میر نے یوں ادا کیا:

ہر آن ہم کو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے
کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ

ناسخ جو پانچویں طبقہ میں ہیں وہ اس مضمون کو یوں باندھتے ہیں:

جائے کافورِ سحر چاہیے کافور حنوط
یہ شب ہجر ہے یارو شب دیجور نہیں

یعنی شب ہجر جب تک ہماری جان نہ لے گی ٹلنے والی نہیں ہے۔ پس کافور سحر کی توقع رکھنی عبث ہے بلکہ اس کی جگہ کافور حنوط غسل میت کے لیے درکار ہے، اگرچہ مضمون کے لحاظ سے تینوں شعروں کو نیچرل کہا جاسکتا ہے کیونکہ شوق انتظار کی حالت میں ممکن ہے کہ عاشق کو ایک ایک گھڑی جگ

Scanned with CamScanner

اور ایک ایک آن برس کے برابر معلوم ہو اور ممکن ہے کہ عاشق طول شب فراق سے تنگ آکر جینے سے مایوس ہو جائے۔ مگر ناسخ کی طرز بیان اُردو کی معمولی بول چال سے اس قدر بعید ہے کہ اس کو کسی طرح نیچرل بیان نہیں کہا جا سکتا۔

تیسری مثال شاہ حاتم جو پہلے طبقہ میں شمار کیے گئے ہیں وہ دوست کے ملنے کی آرزو اور اس کے دیکھنے کے شوق کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

زندگی درد سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

اسی مضمون کو میر نے یوں باندھا ہے:

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

سودا یوں کہتے ہیں:

دل کو آرزو ہے صبا ٹھوئے یار میں
ہمراہ تیرے پہنچے مل کر غبار میں

منشی امیر احمد صاحب امیر جو موجودہ طبقہ کے مشہور شاعر ہیں وہ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:

واکردہ چشم دل فرش پاہوں میں
ہر رہگذر میں راہ تیری دیکھتا ہوں

اس مثال میں تینوں شعروں کو اگرچہ خیال کے لحاظ سے نیچرل کہا جا سکتا ہے مگر اخیر شعر کے بیان میں بمقابلہ حاتم اور میر و مرزا کے صاف تصنع اور ساختگی پائی جاتی ہے اور بیان نیچرل نہیں رہا۔ اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو ان سے بہت زیادہ صریح اور صاف مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔

اوپر بیان سے ہرگز سمجھنا نہیں چاہیے کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ ان نیچرل ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ ممکن ہے کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو قدما کی جولانگاہ کے علاوہ ان دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں۔ یا اسی جولانگاہ کو کسی قدر وسعت دیں، یا زبان میں بہ نسبت متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت اور صفائی پیدا کر سکیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ اور میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی ہے اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

اسی طرح ولی میں ذوق، ظفر اور خاص داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کرنا

تیسری بات زبان اُردو کو درستی اور صفائی کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔ اگرچہ اُردو کم وبیش تمام اطراف ہندوستان میں متداول ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض ممالک کے باشندے اپنی خاص زبان میں بہ نسبت اُردو زبان کے زیادہ آسانی سے شعر سرانجام کر سکیں۔

پس اگر ہمارے ہم وطنوں میں کوئی شخص اپنی خاص زبان میں شعر کہنا چاہے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ مادری زبان سے بہتر اور سہل تر کوئی آلہ اظہار خیالات کا نہیں ہو سکتا۔ لارڈ میکالے کا قول ہے کہ ''کوئی عمدہ کلام جو خیالات کا مجموعہ ہو کبھی کسی شخص نے سرانجام نہیں کیا۔ مگر ایسی زبان میں جس کی نسبت اس کو مطلق یاد نہ ہو کہ کب سیکھی اور کیونکر سیکھی اور جس کی گرامر جاننے سے پہلے وہ ایک مدت تک اس میں گفتگو کرتا رہا'' وہ لکھتے ہیں کہ ''روما کے بڑے بڑے لایق آدمیوں نے فرانسیسی زبان میں اشعار لکھے مگر ان میں سے کوئی شعر صفحہ روزگار پر یادگار نہ رہا۔ انگلستان کے بہت سے خوش فکر اور طباع آدمیوں نے لاطینی میں دیوان مرتب کیے مگر ان میں سے ایک دیوان بھی یہاں تک کہ ملٹن کا دیوان بھی شاعری کے لحاظ سے اول درجہ کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ دوسرے درجہ میں بھی کچھ امتیاز نہیں رکھتا۔'' پس کہ ملکہ شاعری ایک فطری اور جبلی چیز ہے اسی طرح اس کو کام میں لانے کے لیے ایسے آلہ کا استعمال زیادہ مناسب ہوگا جو بمنزلہ فطری اور جبلی چیزوں کے ہو اور وہ مادری زبان نہیں ہو سکتی۔

لیکن چونکہ اُردو زبان ہندوستان کی اور تمام زندہ زبانوں کی نسبت بالاتفاق زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لائق ہے۔ تمام اطراف ہندوستان میں عموماً بولی اور سمجھی جا سکتی ہے اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اسی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اسی کو ترقی دی جائے نیز اس کا حاصل کرنا اور اس میں کافی مہارت بہم پہنچانی ہندوستان کے باشندوں کو اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ اور غیر مادری زبانوں میں دشوار ہوتی ہے۔

اس کے سوا ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں بالفعل کوئی زبان ایسی نہیں ہوتی جس میں اُردو کے برابر شعر کا ذخیرہ موجود ہو۔ اس لئے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہموطنوں میں

Scanned with CamScanner

جو شخص شعر کہنا اختیار کرے وہ اُردو ہی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ قرار دے۔

ہندوستان میں جیسا کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہاں کی اُردو معتبر سمجھی جاتی ہے دلّی اور لکھنؤ۔ دلّی کی زبان اس لئے ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے کہ اُردو کا حدوث اور نشوونما اسی خطہ میں ہوا ہے۔ لکھنؤ کی زبان کو اس واسطے مستند مانا جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتدا سے شرفائے دہلی کے بے شمار خاندان ایک مدت دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیے وہیں رہ پڑے۔ پس ہندوستان کے کسی شہر کو اہل دہلی سے اس قدر میل جول کا موقع نہیں ملا۔ جس قدر لکھنؤ کو ملا۔ یہاں تک کہ دونوں شہر کی زبان میں ایک خاص مماثلت پیدا ہوگی ہے۔ اور خاص خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونوں جگہ کی بول چال اور لب ولہجہ میں کوئی معتدبہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

کوئی زبان تمام ملک میں یکساں طور پر اس وقت تک شائع نہیں ہوسکتی جب کہ متعدد ذیل ذریعے ملک میں مہیا نہ ہوں:

۱۔ اس زبان کو معتبر اور جامع ڈکشنری کا تیار ہونا۔

۲۔ اس کی جامع گریمر کا مرتب ہونا۔

۳۔ اس میں کثرت سے نظم ونثر کی کتابوں کا تصنیف وتالیف ہوکر شائع ہونا۔

۴۔ اس زبان کے اخبارات ورسائل کا تمام اطراف وجوانب ملک میں اشاعت پانا۔ ظاہر ہے کہ:

آج تک اُردو کی کوئی جامع اور مستند ڈکشنری تیار ہوئی ہے اور نہ اس کی کوئی ایسی گریمر لکھی گئی ہے جس سے زبان کے سیکھنے میں کافی مدد ملنے کی امید ہو۔ اُردو میں تصنیف وتالیف کا رواج اور اخبارات وغیرہ کی اشاعت زیادہ تر بیس پچیس برس سے ہوئی ہے اور اس قدر قلیل مدت زبان کی ترویج کے لیے کافی نہیں ہوسکی۔

اگرچہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اُردو لٹریچر کی جس قدر اشاعت ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، اسی قدر اُردو زبان کی تحریر اور نظم ونثر لکھنے کا سلیقہ اطراف ہندوستان میں عموماً بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن شاعرانہ خیالات اور خاص کر نیچرل شاعری کے فرائض ٹکسالی زبان میں ادا کرنے کے لیے ایسے محدود ذریعے شاید کافی نہ ہوں۔ اگرچہ ایک جامع اور مستند ڈکشنری بھی (اگر کوئی ہو) اس مقصد کو پورا کرنے میں بہت کچھ مدد پہنچا سکتی ہے۔ مگر اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور اس کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا کہ ان کے الفاظ ومحاورات بقدر معتدبہ نامعلوم طور پر

زبان پر چڑھ جائیں۔ لیکن چونکہ ایسا موقع ہر شخص کو ملنا دشوار ہے اس لیے ضرور ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے نہ اس ارادہ سے کہ خیالات اور مضامین میں ان کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں، خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔

ابنِ خلدون کہتے ہیں کہ ''ایک عجمی فصحائے عرب کے کلام کی مہارت سے اہلِ زبان میں شمار کرنے کے لائق ہو سکتا ہے'' پس ہندوستان کے باشندے اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اہلِ زبان کے کلام کی مزاولت سے مثل اہلِ زبان کے سمجھے جائیں۔

اگرچہ دِلّی کے بہت سے عمدہ شاعروں کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ جیسے خواجہ میر اثر، شاہ نصیر، میر ممنون، معروف، عارف وغیرہ، حالانکہ ان بزرگواروں کے مبسوط اور ضخیم دیوان موجود ہیں۔ لکھنؤ میں بھی کچھ عجیب نہیں کہ وہاں کے بعض مستند لوگوں کا کلام شائع نہ ہوا ہو، لیکن جن لوگوں کے دیوان اور کلیات شائع ہو چکے ہیں ان کی تعداد میں بھی کچھ کمی نہیں ہے۔ اور ان میں سے خاص کر میر، سودا، درد، جرأت، انشا، مصحفی، میر حسن، ناسخ، آتش، وزیر، غالب، ذوق، ظفر، شیفتہ، داغ، سالک، شوق، رند، اسیر، برق، امیر وغیرہ کا ہر قسم کا کلام خواہ غزل ہو خواہ مثنوی خواہ قصیدہ خواہ قطعہ و رُباعی خواہ داسوخت سب دیکھنا چاہیے اور سب سے زیادہ اہم اور ضروری خلیق، ضمیر، انیس، دبیر، اور مونس وغیرہم کے مرثیوں کا مطالعہ ہے۔ اگرچہ بعضے دیوان اور مثنویاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے سراسر لغو خیالات اور بے ہودہ مضامین سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن جو لوگ محض زبان سے غرض رکھتے ہیں ان کو خیالات کی لغویت اور مضامین کی بیہودگی سے چشم پوشی اور اغماض کرنا چاہیے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ، محاورات اور طرزِ ادا اور اندازِ بیان پر ہمت مقصود رکھنی اور خرما صفا و دع ما کدر پر عمل کرنا چاہیے، نظم کے علاوہ اُردو لٹریچر میں جس قدر علمی، تاریخی، مذہبی، اور اخلاقی مضامین پر مستند اہلِ زبان نے کتابیں لکھی ہیں، ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جو لوگ اپنے تئیں اُردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں یعنی اہلِ لکھنؤ، ان کو اس بات پر فخر کرنا نہیں چاہیے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں اور ہمارے روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے اس کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے، اس کے الفاظ و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کریں گے اور اس کی نظم و نثر کو زمانہ کے مزاج کے موافق ترقی نہ دیں گے تو ان کی زبان کا وہ

Scanned with CamScanner

حصہ جس پر ان کو فخر ہے اور جو ان کی اور تمام ہندوستان کی اُردو میں مابہ الامتیاز ہے وہ حرف غلط کی طرح صفحۂ روزگار سے محو ہو جائے گا اور یہی بری بھلی اُردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعے سے ملک میں پھیل رہی ہے اور جس کو وہ اب تک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پائے گی۔ کیا ان کو معلوم نہیں ہے کہ عرب میں جب سے شعر و انشا کی سرد بازاری ہوئی اور عربی نظم و نثر کے مالک غیر ملکوں کے باشندے ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ کلاسیکل عربی جس پر عربوں کو ناز تھا لٹریری دنیا سے رخصت ہو گئی اور وہی بچڑی زبان جس کو عرب عرباء حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تمام عربی لٹریچر پر چھا گئی اور شام و روم و مصر و بربر و سوڈان وغیرہ میں عموماً پھیل گئی۔ یہاں تک کہ آج وہی زبان ٹکسالی اور فصیح عربی سمجھی جاتی ہے ایسا ہی انجام دِلّی اور لکھنؤ کی زبان کا اگر اس کی جلد خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔ دِلّی جس کو اُردوئے معلیٰ کا مسقط الراس اور جنم بھومی کہنا چاہئے وہاں مصنف اور ناظم و ناشر پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں۔ پرانے لوگوں میں سے چند نفوس جن کو چراغ سحر سمجھنا چاہیے باقی رہ گئے ہیں، ان کے بعد بالکل سناٹا نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا، وہاں شاعری کا چرچہ دِلّی سے بہت زیادہ سننے میں آتا ہے۔ وہاں سے ناول اور ڈراما برابر ملک میں شائع ہوتے رہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کا قدم زمانہ کی رفتار کے متوازی نہیں اٹھتا۔ وہ جس قدر آگے بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر ترقی کے رستے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دِلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اُردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے اس کے تمام افعال اور تمام حرف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اُردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے۔ نیز اُردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی یا فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے۔ وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے جاتے۔

Scanned with CamScanner

زبان کے متعلق ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے۔ نیچرل شاعری کے لیے جیسا کہ ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ زبان کافی نہیں ہے اس لیے ضرور ہے کہ اس میں وسعت پیدا کی جائے۔ پس اہلِ لکھنؤ جو زبان کے دائرہ کو روز بروز زیادہ تنگ کرتے جاتے ہیں۔ یہ امر مقتضائے وقت کے بالکل خلاف ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب نے ۱۸۹۰ء میں ایک رسالہ شعر و سخن کے متعلق لکھا ہے اس میں کچھ اوپر پچاس لفظ ایسے لکھے ہیں جن کو خود صاحب رسالہ یا اور اہلِ لکھنؤ واجب الترک خیال کرتے ہیں بعضے ان میں سے خاص لکھنؤ کے ساتھ مختص ہیں۔ اہل دہلی کبھی اس طرح نہیں بولتے جیسے اندھیارا، اندھیرے کی جگہ؛ اجیالا اجالے کی جگہ؛ کیونکہ، کیونکر کی جگہ۔ ایسے الفاظ کا ترک کرنا ہم بھی نہایت مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے لکھنؤ اور دِلّی کی زبان میں مطابقت پیدا ہوتی ہے اگر اہلِ لکھنؤ ایسے الفاظ ترک کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم اور بہت سے الفاظ حاضر کر سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ ترک کرنے سے زبان کی وسعت میں بھی کچھ فرق نہیں آتا۔

اسی رسالہ میں بعضے ایسے الفاظ کو واجب الترک قرار دیا ہے جو اصل زبان کی گریمر یا قیاس لغوی کے خلاف برتے اور بولے جاتے ہیں جیسے موسم بفتح سین یا میت بفتح، یا نشاء بروزن وفا کہ عربی گریمر یا لغت کے موافق موسم بروزن مسجد اور میت بکسرہ یا اور نشاۃ بروزن وحدت ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علم لسان کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو کر کبھی اپنی اصلی صورت قائم نہیں رکھ سکتے۔ الا ماشاء اللہ، دور کیوں جاؤ ہماری اُردو ہی میں ہزاروں لفظ سنسکرت، پراکرت اور بھاشا کے داخل ہیں۔ باوجود اس کے شاذ و نادر ہی ایسے الفاظ نکلیں گے جو اپنی اصلی صورت پر قائم ہوں۔ مثلاً گھر، گھڑا، جلا، آدھا، اندھیرا، آنکھ، آگے، انگلی، یہ تمام الفاظ سنسکرت کے مفصلۂ ذیل الفاظ سے بگڑے ہوئے ہیں یعنی گرھ، گھٹ، اجل، اردھ، اندھکار، آشرے، اکھی، اگر، اگرو، اسی طرح پراکرت اور بھاشا کے صدہا الفاظ اپنی اصل کے خلاف ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ مگر چونکہ ان کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں اس لیے ان کو صحیح سمجھ کر بے تکلف بولتے اور برتتے ہیں۔ لیکن عربی یا فارسی جس سے کہ ان کو فی الجملہ واقفیت ہے جہاں اس کا کوئی لفظ اصل زبان کے خلاف کسی کی اُردو زبان یا نثر میں دیکھا اور فوراً ناک چڑھائی۔ حالانکہ خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں مثلاً غش، بجائے غشی، مسلمان بجائے مسلم، محافہ بجائے محفہ، غلطی بجائے غلط، زیادتی بجائے زیادت، سلامتی

بجائے سلامت، ہدیہ بجائے ہدیہ، مغیلاں بجائے ام غیلاں، محابا و مدارا وغیرہ بجائے محابات و مدارات وغیرہ کے علی ہذا القیاس فارسی کے الفاظ بھی اکثر اُردو میں غلط بولے جاتے۔ اہلِ ایران عربی کے صدہا لفظ غلط تلفظ کے ساتھ یا غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً صم و بکم، بجائے اصم و بکم، حور بجائے حوراء، ابدال بجائے بدیل، فضولی بجائے فضول، حضوری بجائے حضور، قراٰن بجائے قرآن، مشاط بجائے مشاطہ، موساومفاجاوغیرہ بجائے مواسات و مفاجات وغیرہ انگریزی میں تمام دنیا کی زبانوں سے الفاظ لیے گئے ہیں مگر کسی لفظ کو اس اصلی صورت پر قائم نہیں رکھا۔ مثلاً خلیفہ، ترجمان، مخزن، نواب، تعریف، قطن امیر البحر، عثمان، فردوس، منان، سپاہی، شغال، کاروان، شکر، قرمزی کی جگہ جو کہ عربی و فارسی زبان کے الفاظ ہیں، کیلف، ڈریگومین، میگزین، عیباب، ٹیرف، کاٹن، ایڈمرل، اوٹومن، پیریڈائز، منزٹ، سیپوے، جینکول، کیروان، شگر، کرمسن بولتے اور استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جا کر اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے۔ پس جبکہ موسم یا میت یا نشا وغیرہ ہمارے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہیں تو اُردو نظم و نثر میں ان کو کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی سے اُردو میں لیے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہوتے ہیں، یہ سمجھنا غلط ہی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں، نہیں بلکہ ان کو اُردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے، جو اصل کے لحاظ سے عربی و فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ ایسے الفاظ کو غلط سمجھ کر ترک کرنا اور ان کو اصل کے موافق استعمال کرنے پر مجبور کرنا بعینہٖ ایسی بات ہے کہ لال ٹین کے بولنے سے لوگوں کو منع کیا جائے۔ اور لینٹرن بولنے پر مجبور کیا جائے یا گھڑا بولنے سے روکا جائے اور گھٹ بولنے کی تاکید کی جائے۔

عام غلطی اور عوام کی غلطی میں بہت فرق ہے۔ جو غلط الفاظ خاص و عام دونوں کی زبان پر جاری ہو جائیں، وہ عام غلطی میں داخل ہیں۔ ایسے الفاظ کا بولنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ صحیح بولنے سے بہتر ہے۔ ہاں جو غلط الفاظ صرف عوام اور جہلا کی زبان پر جاری ہوں نہ کہ خواص اور پڑھے لکھوں کی زبان پر، البتہ ایسے الفاظ کو ترک کرنا واجب ہے: جیسے مزاج کو مجاز کہنا منکر کو نا منکر خالص کو نا خالص، ناحق کو بے حق، دروازہ کو دروزہ، نسخہ کو نخسہ، وغیرہ وغیرہ۔

ان کے سوا بہت سے ایسے الفاظ واجب الترک بتائے ہیں جو شعرائے متقدمین نے

Scanned with CamScanner

عموماً استعمال کیے ہیں اور دہلی کے بعض شعراء اب بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر روزمرہ کی بول چال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آج تک دلّی کے خاص و عام برابر بولتے رہے ہیں۔ جیسے تئیں، کبھو، کسو، آنکے، آخرش، پہنانا، (پنھانے کی جگہ) بتلانا، دکھلانا وغیرہ، سدا (بمعنی ہمیشہ) تلک سمیت مت، بجائے حرف نفی، بن (بمعنی بے یا بغیر) پہ (پر کی جگہ) کیجے، دیجے، لیجے، بجائے، کیجیے، دیجیے، لیجیے، مراترا، مرااور تیرا، کی جگہ پر بمعنی مگر۔ اک بجائے ایک، زور بمعنی عجیب یا نہایت۔ یہ الفاظ شاید لکھنؤ میں ترک ہو گئے ہوں یا ہو جائیں لیکن دہلی اور مضافات دہلی میں وہ کم و بیش برابر بولے جاتے ہیں اور زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بولے جائیں گے اور بولے نہ جائیں گے تو تحریروں میں ضرور مستعمل رہیں گے۔ شاید نثر میں بعض الفاظ کی ضرورت نہ پڑے لیکن شعر میں ان کی ضرورت ہمیشہ رہے گی، (اگرچہ اس میں کلام ہے کہ شعر کی بھی ضرورت رہے گی یا نہیں)۔

جو صاحب ایسے الفاظ ترک کرنے کی عام ہدایت کرتے ہیں ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو آپ تو ملتان میں مقیم ہیں اور کشمیر جانے والوں کو اجازت نہیں دیتے کہ جڑاول کا بوجھ اپنے ساتھ باندھ کر لے جائیں۔

اس مضمون کے متعلق زیادہ بحث کرنی فضول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جس ضرورت کے لحاظ سے ہم زبان کے دائرہ کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر فی الواقع وہ ضرورت پیش آنے والی ہے تو یہ قیدیں خود بخود اٹھتی چلی جائیں گی اور لوگوں کو بجائے اس کے کہ اپنی زبان کو تنگ اور محدود کریں مجبوراً دوسری زبانوں سے دریوزہ گری کرنی پڑے گی اور اگر اُردو لٹریچر کی ترقی کا خیال ایسا ہی دوراز کار خیال ہے جیسا مسلمانوں کو عملی، تمدنی، اور اخلاقی ترقیات کا تو یہ بحث پیش از وقت نہیں بلکہ نا وقت ہو گی۔

فکر شعر کی طرف کس حالت میں متوجہ ہونا چاہیے

چوتھی بات یہ ہے کہ فکر شعر کی طرف کس حالت میں متوجہ ہونا چاہیے بعضوں کی یہ رائے ہے کہ رات کو سونے سے پہلے اور دن کو طعام چاشت سے پہلے شعر میں طبیعت زیادہ راہ دیتی ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ ''وحشی مضامین کو رام کرنے والی کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جیسا آب رواں اور تنہائی اور بلند نشیمن۔'' لیکن ہمارے نزدیک فکر شعر کے لیے کوئی موقع اور محل اس سے بہتر نہیں کہ کسی مضمون کا جوش شاعر کے دل میں خود بخود پیدا ہو۔ پھر اس کے لیے باغ اور جنگل، آبادی اور ویرانی، سبزہ زار اور

Scanned with CamScanner

چٹیل میدان، آب رواں اور پپڑ زمین سب برابر ہے۔ ابونواس جب تک کہ پھول کے گلدستہ اس کے سامنے نہ رکھے جاتے تھے، شعر کی فکر نہیں کرتا تھا۔ ابوالعتاہیہ نے ایک روز اس سے پوچھا کہ کیا آپ کو بغیر اس کے مضمون نہیں سوجھتا۔ میں تو بیت الخلا میں شعر کہا کرتا ہوں۔ ابونواس نے کہا کہ اسی لیے تو اس سے بدبو آتی ہے۔'' لیکن ہمارے نزدیک فکر شعر کے لیے نہ گلدستوں کی ضرورت ہے اور نہ بیت الخلا میں بیٹھنے کی۔ بلکہ صرف جوش اور ولولہ کی ضرورت ہے جو کسی قید اور شرط کا محتاج نہیں ہے۔ کثیر (۱) سے لوگوں نے پوچھا کہ تو نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا، کہا: ''جوانی جس سے امنگ دل میں پیدا ہوتی تھی گذر گئی۔ عزہ جو دل کو گرماتی تھی مر گئی اور عبدالعزیز جس سے صلہ کی توقع تھی وہ بھی نہ رہا۔ اب کونسی چیز باقی ہے جو شعر کہوائے۔'' گویا اس نے اس بات کا اشارہ کیا ہے کہ جب تک دل میں کسی قسم کا جوش اور ولولہ نہ ہو اس وقت تک شعر سرانجام نہیں ہوسکتا۔ فرزدق کہا کرتا تھا کہ ''میں یاس و نومیدی کی حالت میں اشعر الناس ہوں، لیکن بعض اوقات میرا یہ حالت ہوتا ہے کہ دانت کو مسوڑے سے اکھیڑنا مجھ کو آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت شعر کہنے کے۔'' یعنی بغیر اقتضائے طبیعی اور دلی جوش کے شعر سرانجام نہیں ہوسکتا۔ خریمی شاعر سے پوچھا گیا کہ کیا سبب ہے تیرے مدحیہ قصیدے جو محمد بن منصور کی شان میں اس کی زندگی میں تو نے لکھے تھے بہ نسبت مرثیوں کے جواب تو اس کی نسبت لکھتا ہے زیادہ عمدہ ہیں۔ اس نے تسلیم کیا اور نہایت ایمانداری سے جواب دیا کہ ''ہماری امیدیں اور خواہشیں زیادہ قوی اور پرزور ہیں بہ نسبت ہماری وفاداری اور حق گذاری کے۔ قصیدے ہم سے امید لکھواتی تھی اور مرثیے وفاداری لکھواتی ہے۔ اس لیے دونوں میں فرق بین نظر آتا ہے۔'' غرضیکہ جب تک دل میں کسی بات کی چبھک نہ ہو، قوت متخیلہ مضامین کے القا کرنے میں فیاضی نہیں کرتی۔ مگر جوش شاعر کے کلام میں جبھی تک باقی رہ سکتا ہے کہ کوئی شے اس کی آزادی کی مزاحم نہ ہو اس کی آزاد طبیعت کسی خوف وروک ٹوک کی کچھ پروانہ کرے۔ ورنہ ممکن ہے کہ جس مضمون کا جوش فی الوقع اس کی طبیعت میں موجود ہے اس کو وہ عمدگی اور خوبی کے ساتھ ادا نہ کر سکے۔

آزادی کی مزاحمت کئی طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی شاعر کو کسی کا خوف اپنے خیالات آزادنہ ظاہر کرنے سے مانع ہوتا ہے۔ چنانچہ کثیر عزہ اور کمیت بن زید جو نہایت پکے شیعی تھے، ان کی نسبت کہا گیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے بنی ہاشم کی مدح میں کہا ہے وہ شاعری کے لحاظ سے اس درجہ کا نہیں ہے'

(۱) کثیر عرب کا ایک مشہور شاعر ہے جس کی معشوقہ کا نام عزہ تھا۔ اور عبدالعزیز بن مروان اس کا ممدوح تھا۔ جہاں کثیر عزہ لکھتے ہیں وہاں اسی سے مراد ہوگی ہے۔

Scanned with CamScanner

جیسے بنی امیہ کی مدح کے قصیدے۔ لیکن ایسی مزاحمت آزاد طبع شاعر کے جوش کو بعض اوقات زیادہ اُبھار دیتی ہے۔ جعفر برمکی کے مرثیے لکھنے پر لوگ قتل تک کیے گئے۔ باایں ہمہ بعضوں نے اس کے مرثیے ایسے جوش وخروش کے ساتھ لکھے ہیں کہ آج تک یادگار ہیں۔

کبھی سوسائٹی کا دباؤ یا لالچ اور طمع یا اور کوئی ترغیب اس کی طبیعت کے بہاؤ کا رخ سیدھے رستے سے دوسری طرف پھیر دیتی ہے۔ یہ افتاد ہمارے اکثر شاعروں پر پڑتی ہے اور اس نے بہت سے ہونہار اور روشن طبع شاعروں کو ہزال وفاش ومسخرہ تک بنادیا ہے۔ کبھی شاعر کے پیچھے ایک کرا ایسی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے: مثلاً ہر تقریب یا تہوار پر تہنیت کا قصیدہ لکھنا۔ یا ہر ہفتہ یا عشرہ میں مشاعرہ کی طرح پر غزل سرانجام کرنی۔ گو بظاہر اس میں آزادی کی کچھ مزاحمت نہیں معلوم ہوتی لیکن انسان کی نیچر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایسی ایسی کریں اس کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیتی ہیں وہ جس طرح ممنوعات پر بالطبع حریص ہے اسی طرح تکلیفات[1] سے بالطبع ابا کرنے والا ہے۔ انشاء اللہ خاں جب تک مطلق العنان رہے سعادت علی خان کے دربار میں نت نئے شگوفے اور چٹکلے چھوڑتے اور بات بات پر لطیفے انشا کرتے تھے۔ لیکن جب سعادت علی خان نے یہ کرا لگادی کہ ہر روز دو ایسی نئی باتیں بیان کردیا کرو جو کبھی نہ سنی ہوں[2] پھر وہی انشاء اللہ خاں تھے کہ پاگلوں کی طرح گلی کوچوں میں لڑکوں سے پوچھتے پھرا کرتے تھے کہ بھئی کوئی نئی بات بتاؤ۔ آخر اسی جستجو میں قطعی پاگل ہوگئے۔ یورپ کے ایک زبردست شاعر کا حال سنا ہے کہ جب اس نے اپنی آئندہ تصنیفات کا کاپی رائٹ کسی پبلشر کے ہاتھ فروخت کردیا تو وہ کہا کرتا تھا کہ اس معاہدے سے میری طبیعت بند ہوئی جاتی ہے۔ جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں ساتھ ہی یہ خیال گذرتا ہے کہ اب ہم جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل کی اپج سے نہیں بلکہ اپنا معاہدہ پورا کرنے کو لکھتے ہیں۔ اسی خیال سے طبیعت خود بخود بیٹھی جاتی ہے۔

بہر حال جہاں تک ممکن ہو کسی مضمون کے لکھنے پر اس وقت تک قلم اٹھانی نہیں چاہیے جب تک اس کی چینک دل کو نہ لگی ہو۔ کسی کی ریس سے، کسی کی فرمائش سے، کسی کے دباؤ سے یا کسی اور مجبوری کے سبب بغیر اقتضائے طبیعی اور ولولۂ باطنی کے جو شعر کہا جائے گا، یا نظم سرانجام کی جائے گی اس میں اثر اور زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے۔

(۱) تکلیف کرا لگانے کو کہتے ہیں جیسے تکلیف شرعی۔ (۲) یہ قصہ آب حیات از محمد حسین آزاد، میں مذکور ہے۔

Scanned with CamScanner